یکم دسمبر ۱۹۷۳ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۲ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۴۵

رجسٹرڈ نمبر ایل ۹۲۲
فون نمبر ۲۹

ایڈیٹر
آل احمد سرور

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت فی کاپی ۲۰ پیسے

اداریہ

کانفرنس کی خبریں

یہ تو اعلان ہو ہی چکا ہے کہ انجمن کی کل ہند اردو کانفرنس ۲۹، ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو دہلی میں ہوگی۔ اس کا افتتاحی اجلاس ۲۹ دسمبر سنیچر کو تین بجے وگیان بھون میں ہوگا۔ باقی اجلاس ۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو ایوان غالب، ماتا سندری لین نئی دہلی میں ہوں گے۔ مفصل پروگرام اگلی اشاعت میں دیا جائے گا اور اس کے علاوہ تمام ڈیلی گیٹ صاحبان اور استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں کو بھیجا جائے گا۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ میر مشتاق احمد صاحب نے مجلس استقبالیہ کا جنرل سکریٹری ہونا منظور کر لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی مقبولیت اور اثر کی وجہ سے استقبالیہ کمیٹی کو سارے انتظامات کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔ ۲۴ دسمبر کو مجلس استقبالیہ کے جلسے میں کچھ ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) فنڈ جمع کرنے کی کمیٹی۔

کنوینر: میر مشتاق احمد

ممبران۔ جناب شیو چرن گپتا، کنور مہندر سنگھ بیدی، حمیدہ سلطان، گلزار دہلوی۔

(ب) سوونیر کمیٹی۔ صدر۔ جناب وی۔ شنکر

نائب صدر۔ جناب شیو چرن گپتا، کنور مہندر سنگھ بیدی

کنوینر۔ ڈاکٹر اسلم پرویز۔

(ج) والنٹیر کمیٹی۔ کنوینر: گلزار دہلوی۔

ممبران۔ جناب جاوید وششٹ اور جناب عظمت اللہ

(دہلی کالج)

جناب [illegible] چشتی۔ جامعہ ملیہ

جناب زین العابدین۔ مسلم اسکول

حکیم عبدالشکور۔ بچوں کا گھر

جناب مشکور علی صابری۔ منبر الاسلام

جناب حلیم احمد۔ ترقی اردو بورڈ

جناب محمد یعقوب۔ ترقی اردو بورڈ

(د) مشاعرہ کمیٹی۔ مشاعرے کے سارے انتظامات دہلی کی ریاستی شاخ کرے گی۔

صدر۔ کنور مہندر سنگھ بیدی

سکریٹری۔ حمیدہ سلطان۔

جوائنٹ سکریٹری۔ گلزار دہلوی۔

جن ریاستی شاخوں نے ابھی تک اپنے کوٹے کے مطابق نمائندوں کے نام نہیں بھیجے ہیں ان سے درخواست ہے کہ نمائندوں کی دو فہرستیں بھیجیں، ایک جنرل سکریٹری انجمن کے نام علی گڑھ کے پتے پر دوسری ڈاکٹر خلیق انجم جوائنٹ سکریٹری استقبالیہ کمیٹی، انجمن، کلاں محل دہلی ۶ کے پتے پر۔ ڈیلی گیٹوں کی رپورٹیں صرف علی گڑھ بھیجی جائیں۔ ڈیلی گیٹوں کے فارم دسمبر کے پہلے ہفتے میں روانہ کئے جائیں گے۔ توقع ہے کہ آزادی کے بعد اردو کے علمی و ادبی سرمائے کی نمائش کے علاوہ اقبال پر وہ نمائش بھی جو وزارت اطلاعات و نشریات نے تیار کی ہے اور جس کا مواد جگن ناتھ آزاد نے تیار کیا ہے دکھائی جائے گی۔ انجمن کی نمائش کے سلسلے میں تمام ناشروں سے تعاون کی درخواست ہے۔ نمائش کے بعد کتابیں حسب طلب واپس کی جا سکتی ہیں۔

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

نواب رحمت اللہ خاں شیروانی کو دیکھا — ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کو دیکھا۔ جب ان کے ہی نہیں انکی دوسرے کے لب پر بھی ذاکر صاحب کا نام آیا تو سچ مچ میں نے نطق کو زبان کے بوسے لیتے دیکھا ہے۔

ذاکر صاحب گفتار ہی کے نہیں، کردار کے بھی غازی تھے۔ جو لوگ ذاکر صاحب سے ناراض بھی رہا کرتے تھے کہ محبت سے باتیں کرنا تو ذاکر صاحب کی عادت بن گئی ہے۔ اگر ایسی عادتیں انسانوں میں عام ہو جائیں تو سے داشیں کی لاگ ہی ختم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ خود جنت کو جہنم میں لے کر ڈال دے کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کے یہ پہلو رشید صاحب نے جس خوبصورتی سے پیش کئے ہیں، اس کے لئے فنکار کے قلم اور برش کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دونوں رشید صاحب کے پاس ہیں۔ رشید صاحب نے ان کی مدد سے "تاج محل" کا نقشہ مرتب کئے بغیر، "تاج محل" کی تعمیر کی ہے۔ رشید صاحب کے یہاں "تحریر" کی لذت کا یہ عالم ہے کہ جب ہم ہمارے ذاکر صاحب کے مضامین پڑھتے ہیں تو اسی لمحے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ بات تو ہمارے دل میں بھی تھی لیکن رشید صاحب نے اپنے جادو بیان قلم سے لکھ دیں۔ رشید صاحب کو دل کی بات کو قلم تک لانے کا کمال حاصل ہے — لکھتے ہیں:

"ذاکر صاحب کی رحلت کے بعد اندازہ ہوا کہ کس کس سطح اور طبقے کے کتنے بے شمار لوگ تھے جو اُن سے محبت اور ان کا احترام اس بنا پر کرتے تھے کہ ایسا کرنے سے وہ خود اپنے کو شایانِ شان اور قابلِ احترام سمجھنے لگتے تھے۔

"ذاکر صاحب کی وفات پر کسی نے رائے عامہ کا مرثیہ تو نہیں کیا لیکن بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی اشخاص سے پہلی بات جو سننے میں آئی وہ یہ تھی کہ اب مصیبت میں دلجوئی کون کرے گا اور دشواری میں صحیح مشورہ کون دے گا"

جب ذاکر صاحب کا انتقال ہوا تو میں مورشس میں تھا۔ میں نے ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا —

"وہ جس طرح چھوٹوں سے ملتے تھے اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ہم چھوٹوں میں اُن سے مل کر بڑائی کا احساس ہوتا تھا۔ ذاکر صاحب سے ملنے کے بعد ہمیشہ اپنی شخصیت میں اعتماد پیدا ہوتا تھا۔"

گوکھلے نے گاندھی جی کے بارے میں کہا تھا کہ HE MADE HEROES OUT OF CLAY — یہ بات ذاکر صاحب میں بھی پوری اترتی تھی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کا یہ حال ہوا کہ وہ ان کے گرد منڈلانے لگے، ان کی پرستش کرنے لگے کہتے ہیں چھوٹوں نے ان کے انداز سے چلنا پھرنا، بات چیت کرنا، لکھنا پڑھنا سیکھا۔ انھوں نے بڑے کاموں کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کو خود بھی کیا اور دوسروں کو بھی آمادہ کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہی چھوٹے چھوٹے کام ایک دن بڑھ کر بڑے ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب شہرت، عزت اور بڑائی کے پیچھے نہیں بھاگے، بلکہ اس کے برخلاف شہرت، عزت اور بڑائی ان کے پیچھے بھاگتی رہی۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کردار اور مزاج کے یہ تمام پہلو رشید صاحب نے اپنی کتاب میں اس طرح سمیٹ لئے ہیں کہ ہمیں اس میں ذاکر صاحب کی ذہانت، عظمت اور ذکاوت اور بزرگی — غرض سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذاکر صاحب کو بہت سے سوانح نگار ملے ہیں اور ملیں گے، لیکن وہ رشید صاحب کی نظر اور ان کا قلم کہاں سے لائیں گے۔ وہ تو بات میں بات پیدا کرتے ہیں۔ لفظوں سے بے تکلفی سے کھیلتے ہیں اور یہ الفاظ ان کے ہاتھوں میں موم بن جاتے ہیں۔ پھر رشید صاحب ان سے بہت سے مجسمے بناتے ہیں۔ ایک ہی شخص کے کتنے بہت سے مجسمے اور اس میں حیرت کی کیا بات تھی اس لئے کہ ذاکر صاحب کی شخصیت بھی تو رنگا رنگ تھی۔

رشید صاحب لکھتے ہیں کہ "ذاکر صاحب نے اپنی سرگزشت نہیں لکھی"۔ میں سوچتا ہوں کہ ذاکر صاحب لکھتے تو کیا لکھتے، وہ اپنے بجائے دوسروں کے بارے میں لکھتے۔ علم و دانش پر لکھتے۔ تہذیب و شائستگی کے متعلق لکھتے — وہ پاکیزگی اور لطافت کا ذکر کرتے جو چاہے جسم کی ہو یا روح کی — انسانی اقدار کے دفتر کے دفتر لکھتے۔ شعر و ادب کی عبارت و اشارت کی وضاحت کرتے یا حکما اور ائمہ کے اقوال کو دہراتے۔ کیونکہ ذاکر صاحب کی زندگی ان ہی چیزوں سے عبارت تھی — آنچہ خوباں ہمہ دارند — وہ یہ تمام اوصاف تنہا رکھتے تھے۔

اس کتاب کا آخری مضمون "ایا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" بڑے درد و کرب کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہاں لفظوں کے سینے میں آنسوؤں کے قطرے بھرے ہوئے ہیں جو سانسوں کے ساتھ چھلکتے رہتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر)

لکھنؤ کی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس میں مولانا عثمان فارقلیط

کے خطبۂ صدارت کا خلاصہ

نئے صنعتی دور کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں۔ آج جب کہ اردو اخبارات کو ایک صنعت قرار دیا جا چکا ہے، صنعتوں کے سارے تقاضے آپ کو پورا کرنا ہونا چاہئے لگے۔ پھر اسی لحاظ سے آپ کو اپنی املیات کو منظم بنانا ہوگا۔ میری توجہ تھا کہ اگر میری بات مانی جاتی تو میں ابھی سے کہتا کہ آپ ملک کی دوسری صحافت کے ساتھ جو بھی چاہیں کریں۔ لیکن اردو صحافت کو تجربے ہی کی خاطر صرف مشن کا علمبردار بنائے دیا۔

میں کہتا ہوں کہ جس طرح قیادتوں اور لیڈروں کے لئے صرف مقصدیت اور خلوص اور ایثار و قربانی ہی معیار ہے۔ اسی طرح صحافت کے ایک ممتاز گوشے "اردو اخبار نویسی" کے لئے بھی یہ معیار باقی رہنے دیجئے۔

آپ کو بہرحال اپنے دور کی باتوں سے نمٹنا ہے۔ اس دور کے مسائل میں جن چند باتوں کو میں آپ کے لئے پریشان کن سمجھتا ہوں ان پر آپ کی توجہ خود بھی منعطف ہے۔ تاہم میرا بھی فرض ہے کہ ان کی یاددہانی کر دوں تاکہ اس کانفرنس کی کارروائیوں میں سے آپ وقت نکال کے ان پر غور کریں اور اجتماعی فیصلہ کریں۔

ترقی کے تقاضے

پہلا اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آپ ملکی صحافت کے مقابلے میں کس قدر دور تو ہو چکے ہیں، دنیا کے نہیں بلکہ اپنے ملک کے اخبارات کو دیکھیں اور ہفتہ وار روزناموں اور ماہنامہ پرچوں کو سامنے رکھ کر موازنہ کریں تو آپ کو اپنی پسماندگی کا آسانی سے اندازہ ہو جائے گا۔ کالم نویس، تبصرہ لکھنے والے، تجارت، صنعت، "جنگ" اور اقتصادیات کے ماہرین، تحقیقی مقالہ نگار آپ کے معاصر اخبارات و رسائل کی زینت ہیں لیکن اردو کے نئے پیچھے چلنے والوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

ایک مسئلہ خبر رساں ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کا ہے، جن کی اہمیت، افادیت اور وسعت کافی پھیل گئی ہے۔ خبروں میں ندرت پیدا کرنے کے لئے آمد کے نئے ذریعوں پر آپ کو غور کرنا چاہئے۔ اور کوئی ریسرچ یا پراجکٹ بنوانے پر زور دینا چاہیے'۔

ایک مسئلہ نئے اخبار نویسوں کو اپنی صفوں میں شامل کرنے اور ان کی تربیت کا ہے۔ موجودہ صنعتی دور میں نوجوانوں کے لئے اب وجہ کشش مقصد سے عشق نہیں بلکہ معیار زندگی ہے۔ اور اسی وجہ سے اردو صحافت کی گود نئی صلاحیتوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

پھر ایک مسئلہ فن خوشنویسی کا ہے۔ خط نستعلیق فی الاصل مصوری کی ایک شکل ہے جسے اردو زبان نے فارسی کے وارث اور کئی صدیوں کے امین کی حیثیت سے اپنایا تھا مگر آزاد ہندوستان میں صنعت کے رجحانات نے اسے تباہ کر ڈالا ہے۔ رجحانات کی اس شور و نے اس فن کو کثافت قرار دے کر لاوجہ کی ایک کشمکش پیدا کر دی ہے۔ اور اس فن اور کثافت دونوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ اردو میں ٹائپ کے رواج کی متعدد کوششیں کی گئیں، لیکن نستعلیق نے مزاجوں میں جو رچاؤ پیدا کر لیا ہے، اس کے بعد اردو والے اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں، اور یہ مسئلہ آپ حضرات کے سوچنے کا ہے کہ نستعلیق کا خط باقی رہے، خوشنویسی کا فن ترقی پائے اور اس میدان میں نئے چہرے نمودار ہوتے رہیں۔

انتظامیہ کی اہمیت

ایک اور مسئلہ اخبارات کے انتظامیہ کا ہے، پہلے مینجمنٹ کی حیثیت ثانوی ہی تھی مگر اب جب کہ ایامات کی اہمیت بڑھ گئی ہے، انتظامیہ کو بھی اولین حیثیت دی جانا ضروری ہے۔ لیکن اردو صحافت جنہیں اس سے خالی ہے۔ بہ سبب ان امور کیا ان کے سلسلے میں آپ اپنی نشستوں میں غور کیجئے اور وہ راستے نکالئے کہ آپ مقابلہ کی دوڑ میں حصہ لے سکنے کے لائق بن سکیں۔

ایک زمانہ میں اردو صحافت ملک میں سب سے ممتاز مقام رکھتی تھی، جب شعبۂ حیات پر اس کی نگرانی تھی اور اس کا سکہ ہر جگہ چل رہا تھا۔ سائنس، ٹکنالوجی، ادب، فنون لطیفہ، قانون، اقتصادیات، مذہب، معاشرت، سیاست، اخلاق، غرض ہر وادی میں اردو صحافت سے خدمت لی جاتی تھی۔ ہر ہر صنف میں متعدد اردو اخبارات شائع ہوتے تھے، اور اپنا مقام پیدا کرتے اور اپنی ضرورت منواتے چلے جا رہے تھے۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد آگے بڑھنے کے بجائے یہ مرحلہ آگیا کہ آپ اپنے بچے کچھے اثاثہ کو کسی طرح محفوظ رکھ سکیں۔ اس تحفظ کے محدود دائرے سے نکل کر آپ کو یہ سوچنا ہے کہ کس طرح آگے کی طرف پیش قدمی کریں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اپنی ان مساعی میں کامیاب ہوں۔

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ لکھنؤ میں ہی اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی پہلی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ یہ اب سے ۵۰ سال پہلے دسمبر ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔ جب منشی رام رچھپال سنگھ شیدا، ڈپٹی ایڈیٹر ہندوستان لاہور کی صدارت میں اس طرح کی ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اور اس وقت کی مشکلات پر غور و خوض کیا گیا۔ اب پھر اسی لکھنؤ کو اردو ایڈیٹروں کی پہلی آل انڈیا کانفرنس کی مہمان نوازی کا موقعہ ملا ہے۔ اس کانفرنس میں یو۔پی، دہلی، ہریانہ، پنجاب، جموں و کشمیر، ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، آندھرا، تامل ناڈو، بنگال، اڑیسہ اور بہار کے نمائندے شریک ہیں اور اپنی موجودگی سے اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ دستور میں مندرج پندرہ زبانوں میں سے اردو کا دائرہ کتنا وسیع ہے

خدا کرے آپ اپنی وسعت کے شایان شان اس زبان کی صحافت کو ترقی کی راہوں پر ڈالنے کا کوئی اچھا منصوبہ بنا سکیں۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو میرا یقین ہے کہ یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو عرصہ تک یاد کیا جاتا رہے گا۔

قلم کی آبرو

آخر میں آپ سے اتنی گزارش کرنا اور ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ قلم کی آبرو کے محافظ ہیں۔ آزادی افکار اور آزادی ضمیر ایسی دولت ہے جس کی ہر قیمت پر حفاظت کیجیے یہی صحافت کی اصل شان ہے۔ جس کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ اندیشوں کے طوفان اور لالچ کی ترغیبات میں گھرے ہوئے ہیں۔ خدانا کردہ اگر آپ کا اس شاہراہ میں قدم پھسل گیا تو آپ اپنے ساتھ پورے سماج کا اعتماد مجروح کر دیں گے اور یہ ایک ایسا حادثہ ہوگا جس کی تلافی برسوں تک ممکن نہ ہو سکے گی۔

میری یہ دعا ہے کہ آپ کی یہ کانفرنس کامیاب ہو اور اس کے ذریعہ اردو صحافت کو نئی توانائی عطا ہو۔ پچھلے دس سال میں اردو صحافت پر جو کچھ بیت چکی ہے میں نہیں چاہتا کہ اس کے شکوہ و ماتم میں آپ اپنا وقت صرف کریں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تو یہ سوچ کر قدم بڑھائیے کہ آپ کو ایک زندہ زبان کی زندہ صحافت کے ترجمان کی حیثیت سے پیش قدمی کرنا اور مسابقت کے میدان میں اپنا مقام حاصل کرنا ہے۔

اڈیٹرس کانفرنس کے سمپوزیم میں شیخ عبداللہ کی تقریر کا اقتباس

ہندوستان میں اگر واقعی اخبارات کو عوام کی زبان اور ان کا ترجمان بننا ہے تو وہ مقامی اور علاقائی زبانوں کے اخبارات ہیں۔ یہی سماج کے باطن اور اس کے اندرون کا نقش ناطقہ بن سکتے ہیں۔ اور اردو اخبارات کا رول یہیں پر پوری قوت اور طاقت سے اجاگر ہونا چاہیے۔ اردو کے بارے میں عام غلط فہمی یہ ہے کہ یہ ملک کے بعض حصوں تک محدود ہے لیکن اس کے تاریخی ارتقا پر ایک سرسری نظر بھی اس غلط فہمی کو غلط ثابت کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو مسلمانوں کے ہندوؤں سے میل جول اور اختلاط کے نتیجے میں وجود میں آئی لیکن یہ ہر حال میں ایک عوامی، جمہوری اور خالص ہندوستانی زبان ہے۔ مغل سلطنت کے وقت جب حکمراں درباروں میں فارسی اور دوسری زبانوں میں گفتگو کرتے تھے، عوامی زندگی کے مختلف مواقع، بازاروں، میلوں، ٹھیلوں اور لین دین میں ایک نئی زبان وجود میں آ رہی تھی جو مختلف مقامی زبانوں کے ساتھ فارسی کی آمیزش سے ایک مشترکہ اظہار کی ضرورت پوری کر رہی تھی یہی زبان اردو کہلانے لگی اور اس کا جنم دہلی کے کوچہ و بازار، یوپی کے کھیت اور کھلیانوں اور حیدرآباد کے بازاروں میں ہوا۔ بعد میں تہذیبی ضروریات نے اسے تقریباً برصغیر کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ اگرچہ کلکتہ، مدراس، بمبئی، سری نگر یا دوسرے مقامات کے لوگ بڑی فصاحت کے ساتھ اس زبان کو استعمال نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس زبان میں بات کرنے اور بات سمجھنے پر ضرور قادر تھے اور اس زبان میں ایک لنگوا فرانکا بننے کی پوری صلاحیت پیدا ہو گئی تھی جس کی طرف خود مہاتما گاندھی نے اشارہ کیا تھا۔ بعد میں افسوس یہ ہے کہ سیاسی تعصب نے ہماری مشترکہ تہذیب کی دوسری نشانیوں کی طرح اس کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ ایک طرف کے متعصبین نے فارسی اور عربی کے بے جوڑ اور مغلق الفاظ کی بھرتی کر کے اس زبان کو بوجھل بنا دیا اور یہ اپنی شیرینی اور چاشنی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور دوسری طرف کے متعصبین نے سنسکرت کے ایسے نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ ٹھونس دیے کہ یہ کسی دوسری دنیا کی زبان معلوم ہونے لگی اور جواہر لال نہرو تک کو آل انڈیا ریڈیو کی خبریں سن کر احتجاج کرنا پڑا کہ یہ ناقابل فہم اور ناقابل استعمال زبان ہے۔ لیکن ان شرانگیزیوں کے باوجود خوش قسمتی سے ابھی تک عوامی سطح پر سیدھی سادی اور عام فہم زبان کا چلن باقی ہے اور اگر اردو اخبارات آگے آ کے اس زبان کو سہارا دیں، اس کو شستہ اور صاف بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس تہذیبی خلا میں وہ اردو زبان کی افادیت اور اہمیت کا لوہا نہ منوا سکیں اور اس زبان کو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کرنے کا جو غلط رجحان پیدا ہو گیا ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ اردو زبان کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں وہ تو خیر ایک علیحدہ کہانی ہے لیکن میرے خیال میں اس تنزلی کی ذمہ داری بنیادی طور پر مسلمانوں کے اس حصے پر عائد ہوتی ہے جس نے سیاسی تعصب کے جنون میں اسے اپنے مذہب کا ایک جزو قرار دینے کی حماقت کی۔ ان برخود غلط لوگوں نے اسلام اور اردو زبان کو لازم و ملزوم قرار دیا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اردو کی ساری گرامر ہندی سے ماخوذ ہے اس کا رنگ و ریشہ کھڑی بولی کے ڈھانچے سے آیا ہے اور اسی کی رگوں میں رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، رام کرشن بسمل، منشی پریم چند، فراق گورکھپوری، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جیسے غیر مسلم ادیبوں کی تحریرات کا لہو دوڑ رہا ہے۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ جب موجودہ دور میں اردو کے سب سے بڑے شاعر اقبال نے کچھ عرصہ کے لئے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا تو سب سے

زیادہ دکھ ایک غیر مسلم درگا سہائے سرور کو ہوا تھا جس نے ان کو پھر سے طبع آزمائی پر مائل کرنے کے لئے یوں غیرت دلائی تھی ؎

"چہک چہک کہ کہاں ہے تو بلبل پنجاب"

چوں کہ اردو بنیادی طور پر سرزمین ہندوستان یعنی یو۔پی، دہلی اور حیدرآباد میں پروان چڑھی ہے اور یہیں پر اس کی جڑیں پیوست ہیں۔ اس لئے جب مسلم لیگی لیڈر قیام پاکستان کے بعد اسے پاکستان لے گئے اور انھوں نے وہاں اسے نصب کرنا چاہا تو واقعات گواہ ہیں کہ پاکستان کی سرزمین اسے راس نہ آسکی۔ وہ اس وقت وہاں پر ایک اقلیت کی زبان ہے اور اس لئے آہستہ آہستہ مرجھا رہی ہے جس کا ثبوت وہ لسانی فسادات ہیں جو اردو کے خلاف وہاں کچھ عرصہ پہلے ہوئے اور فیض احمد فیض جیسے بڑے اردو شاعر کو کھلم کھلا اردو کے خلاف پنجابی کی حمایت کرنا پڑی۔ یہ تمام واقعات گواہی دیتے ہیں کہ ہندوستان کی کوکھ سے پیدا ہونے والی اردو یہیں پر پروان چڑھ سکتی ہے اور اسی سرزمین سے اس کی تقدیر اور مستقبل وابستہ ہیں۔ اور یہ کام اردو والوں کا ہے کہ وہ اس کے غیر ملکی ہونے کے بارے میں تمام غلط فہمیوں کو اکھاڑ پھینکنے کی طرف توجہ دیں۔

ہندوستان میں اردو صحافت کو اس سلسلے میں اہم رول انجام دینا ہے۔ اردو زبان کو اس کے صاف ستھرے، اور پاکیزہ ترین روپ میں پیش کرکے ثابت کرنا ہے کہ یہ دراصل یہاں کے عوام کی زبان ہے۔ ایسا کرکے وہ اپنے دائرہ اثر و رسوخ کو بھی وسعت دے سکتی ہے اور اپنی طاقت کا لوہا منوا سکتی ہے۔ لیکن یہ صرف زبان کے استعمال کا سوال نہیں ہے۔ اردو صحافت کو کردار اور معیار کے اونچے اصولوں کا پرچم تھامنے کے ساتھ ساتھ تدبر اور فراست کا راستہ بھی اپنانا ہوگا۔

اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے فیصلے

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس نے حکومت پر زور دیا ہے کہ یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، دہلی، پنجاب، ہریانہ، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور مغربی بنگال میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ کانفرنس نے اپنی ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا ہے کہ آئین کے مطابق اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔

ایک قرارداد میں مزید مطالبہ کیا گیا ہے کہ پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں اردو پڑھانے کی سہولیات فراہم کی جائیں۔

ایک اور قرارداد میں کانفرنس نے ملک میں اردو صحافت کے ریکارڈ اور ضروریات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیشن قائم کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں چھوٹے درجے کے اردو اخبارات کو مناسب اشتہارات جاری کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔

کانفرنس نے مقبوضہ عرب علاقے خالی کرانے کے لئے فلسطینیوں کی تحریک کی حمایت کی اور حکومت پر زور دیا کہ وہ آزاد فلسطین کو تسلیم کرے۔ کانفرنس نے اپنا آئندہ اجلاس کلکتہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

(صفحہ ۶ سے آگے)

کہتے ہیں جو کسی چیز کے استحکام کے لئے استعمال ہوتی ہو۔ چاہے وہ لاکھ کی چوڑیاں گرم کرنے کی سلاخ ہو یا عینک کے پتلی تار جو عینک کو آنکھوں پر لٹکائے رکھتے ہیں یا پھر دونوں کنارے مڑے ہوئی سلاخ ہو جو چھت میں جھاڑ اور ہانڈیاں وغیرہ لٹکانے کے کام آتی ہے۔ سلاخ چونکہ عام طور پر لوہے کی ہوتی ہے اس لئے سختی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے اور اس سے لفظ "تان کے" بنا ہے جو "زور سے" اور کھینچ کے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

آتش ؎ جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اتاریے
اور "تان کے" خشاخ سے ایک دھول ماریے

اسی طرح ہندی لفظ "تانا" کے معنی گرم کرنے، پگھلانے، تاؤ دینے اور تپانے کے ہیں جو عوام الناس میں "آزمانے" جانچنے پرکھنے اور تجربہ کرنے کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔

گلزار نسیم ؎ تھوتوں اس نے تقاضا کو "تایا"
کھروں کھوٹوں نے داغ کھایا

فارسی لفظ "تانا" اردو نے بھی اپنایا ہے یعنی اس تار کو کہتے ہیں جو پود کے خلاف ہو، یہ وہ طولانی تار ہوتا ہے جو کپڑا بننے کے لئے پہلے ترتیب دیا جاتا ہے۔ عرض کے تار کو پود یعنی بانا کہتے ہیں۔
(تانا شاہ کے تلمیحی قصے کے لئے میری کتاب "تلمیحات" دوسرا ایڈیشن مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ملاحظہ فرمائیں)

رامپور۔ مجید نیازی

مراسلات

اردو کے لئے ٹائپ کا اور رومن رسم الخط کا استعمال

جناب سجاد مرزا صاحب بنیادی ٹائپ کے موجد اور رومن رسم الخط کے حامیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اردو کی ترقی اور مقبولیت کے لئے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی خواہش پر اُن کا یہ مراسلہ اظہار خیال کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

دسمبر میں ہونے والی اردو کانفرنس کے ایجنڈے میں آپ مندرجہ ذیل مسائل اور ان کے متعلق رزولیشن منظور کرائیں تو خوب ہوگا۔

۱۔ اردو کے لئے ٹائپ کا استعمال۔

۲۔ اردو کے لئے رومن رسم خط کا استعمال۔

حیدرآباد میں اردو کو ایک معقول حیثیت دیدی گئی ہے لیکن اردو بولنے والوں نے جو اَن پڑھ اور جاہل ہیں ایک اور مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اردو رسم خط میں اردو زبان کی درخواستیں وغیرہ تیار اور پیش کرنا مشکل ہو گیا ہے اس کا واحد حل یہ ہے کہ رومن رسم خط استعمال کیا جائے یہی حال دوسرے مقامات پر بھی ہوگا۔ ہندی اسٹیٹ میں تو خیر ناگری رسم خط چلنے لگے گا اور اس سے نہ معلوم اردو یا ہندی کو کیا فائدہ یا نقصان ہوگا لیکن رومن رسم الخط کے استعمال سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ کوئی عہدیدار رومن رسم خط کی وجہ سے درخواست سمجھ سکے گا اور قبول نہ کرنے سے احتراز کرے گا آپ کو یاد ہوگا کہ انجمن ترقی اردو نے رومن کو بحیثیت ثانوی رسم خط قبول کرتے ہوئے رومن رسم خط کے لاطینی حروف کا تعین کرنے کے لئے کئی کمیٹیاں مقرر کیں لیکن رسمی طور سے تصفیہ کا اعلان اب تک نہیں ہوا ہے۔ میری رائے ہے کہ اول تو PHONETIC ASSOCIATION نے ہر زبان کے لئے جو علامات CHARACTERS مقرر کئے ہیں ان کی توثیق کر دی جائے اور اس کے علاوہ انجمن جو علامات بطور خاص مقرر کرے اس کا اعلان کر دیا جائے۔ ٹائپ کے لئے ان علامات کے خاص ٹائپ بنانے پڑیں گے PHONETIC ASSOCIATION کے تمام علامات تیار ہیں اور فونڈری سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اس ایسوسی ایشن نے اپنے خاص علامات کے ٹائپ سائیز بھی تیار کر لئے ہیں۔ آپ امور بالا کے متعلق جو تصفیہ فرمائیں اطلاع دیں۔

حیدرآباد۔ سجاد مرزا

تانا شاہ کا املا اور وجہ تسمیہ

ہماری زبان مورخہ یکم نومبر ۱۹۷۲ء میں تانا شاہ کا املا اور وجہ تسمیہ معلوم کی ہے۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ خلد آباد (قریب اورنگ آباد دکن) میں ابوالحسن تانا شاہ کی قبر پر جو کتبہ ڈاکٹر غلام یزدانی۔ ناظم آثار قدیمہ حکومت نظام نے بمنظوری حضور نظام میر عثمان علی خاں نصب کرایا ہے اس میں تانا شاہ کا املا تانہ ہے۔

کہتے ہیں کہ تخت نشینی کے بعد یہ ایسے ہر دلعزیز تھے اور اورنگ زیب کی چڑھائی نے اور زیادہ مقبول کر دیا تھا کہ لوگ ان کے عرف سے ان کو یاد کرنے تھے۔

حیدرآباد۔ سجاد مرزا

(۲)

ہماری زبان مورخہ یکم نومبر ۱۹۷۲ء میں یونس جعفری صاحب نے تانا شاہ کا املا اور وجہ تسمیہ بیان فرمائی ہے۔ اُن کے خیال سے تانا ہندی لفظ تان کا اسم فاعل ہے اور تان کے معنی انھوں نے اکڑ اور سختی کے لکھے ہیں۔ اُن کے بیان کئے ہوئے معنوں سے تانا شاہی بھی نادر شاہی یا اندھیر نگری کے قبیل کی حکومت ہو گئی ہے یعنی ایسی حکومت جہاں ظالموں کو عروج ہو اور مظلوموں کی کوئی داد فریاد نہ ہو۔ درحقیقت تانا ہندی لفظ ہے ہی نہیں۔ یہ تلنگی لفظ ہے جس کے معنی بچہ کے ہیں۔ دکن کے بادشاہ ابوالحسن میں بھی طفلانہ بےتکلفی کافی تھی اس لئے وہ "تانا شاہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔ اسی لئے اردو زبان میں "تانا شاہ" نازک مزاج، آرام طلب اور کم عقل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تانا شاہی ایسی بچکانہ حکومت کو کہتے ہیں جس میں بادشاہ کی کم عقلی اور رعایا سے غفلت کے سبب بدنظمی، افراتفری اور بد انتظامی ہو۔ ظلم و تشدد اور سختی کے معنوں میں اس کا استعمال کبھی نہیں ہوتا ہے۔

سحر ـــ ایک مٹی خس کی ہے، بنگلہ ہے، اپنے آپ میں
ہم بھی تانا شاہ ہیں اس مختصر خس خانے میں

قلق ـــ تانا شاہ کیا، یار پہ نازک مزاجی ختم ہے
عطر صندل کا جو سونگھا، درد سر ہونے لگا

ہندی لفظ "تان" کے معنی جعفری صاحب کے بیان کئے ہوئے معنی سے مختلف ہیں۔ "تان" کے اصل معنی تو الاپ، سُر اور گٹ کے ہیں یعنی ساز کے سُروں کی آواز کا مسلسل اتار چڑھاؤ جو تیزی کے ساتھ ہو۔ اس کے علاوہ لوہے کی ایسی سلاخ کو بھی تان

(باقی صفحہ ۷ کالم ۲ پر)

انجمن کی خبریں

ریاست میں اردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک

حیدرآباد، معتمد انجمن

ترقی اردو شاخ تلنگانہ (آندھرا) مسٹر ایس کے محی الدین نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور مرکز کے بیشتر اور دیگر قائدین کی جانب سے بار بار اس امر کے اعلان کے باوجود کہ اردو ایک خالص ہندستانی زبان ہے اور یہ مرکز اور ریاستوں کی جانب سے ہر ممکن طریقہ پر ہمت افزائی اور تائید و حمایت کی مستحق ہے۔ اس زبان کے ساتھ آندھرا پردیش کے حکمرانوں نے اب تک صرف سوتیلی ماں کا سا سلوک ہی روا رکھا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ریاستی حکومت نے لکچررس کو درس و تدریس اور تحقیقات کے عصری تقاضوں سے واقف کرانے اور ان کی رہنمائی کے لئے ریفریشر کورسس کے انعقاد کی غرض سے حیدرآباد میں "کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سنٹر" قائم کیا اور اس سنٹر کے لئے حکومت کی جانب سے سوائے اردو کے ما بقی تمام زبانوں کے لئے پروفیسرز اور ریڈرز کے تقررات عمل میں لائے گئے۔ جب دیگر زبانوں کے لکچررز کے لئے ریفریشر کورسس کی ضرورت محسوس کی گئی تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ صرف اردو کے لکچررز کے لئے ایک علیحدہ نقطۂ نظر کیوں اختیار کیا گیا اور ان کے لئے کسی ریفریشر کورسس کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی، تلگو، ہندی وغیرہ ہر زبان کے لئے نظامت تعلیمات میں "اسپیشل سیل" اور اسپیشل آفیسرز کی جائدادیں قائم کی گئیں۔ لیکن اردو جیسی ایک اہم ہندستانی زبان کی ضروریات کی تکمیل اور دیکھ بھال کے لئے ایسا کوئی اسپیشل سیل قائم نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسپیشل آفیسر کی جائداد قائم کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے تعلق سے اس نوعیت کے ناپاک امتیازی رویہ سے صرف اردو زبان اور اس کے بولنے والوں کے خلاف ریاست کے حکمرانوں کے تعصب کا پتہ چلتا ہے۔ گو ہمارے ریاستی قائدین نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ اقلیتوں اور ان کی زبانوں کے مفادات کی حفاظت کریں گے لیکن یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ ریاست اور بالخصوص علاقۂ آندھرا کے بیسیوں سرکاری کالجوں میں آج بھی اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جناب ایس کے محی الدین نے کہا کہ وجئے واڑہ میں جہاں اردو داں عوام کی تعداد کسی طرح بھی (۵۰) ہزار سے کم نہیں ہے۔ اردو کی تعلیم کے لئے ایک بھی سرکاری کالج موجود نہیں ہے اور اگر کہیں چند کالجوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام بھی ہے تو ایک بار اردو لکچرر کے ریٹائر ہو جانے کے بعد پھر یہ جائداد مخلوعہ ہی رہتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں عمداً ان جائدادوں کو مخلوعہ رکھا گیا۔ اس طرح طلبہ کو تعلیمی کورس میں اردو زبان کے بہ حیثیت ایک مضمون لینے کی قصداً حوصلہ شکنی کی گئی۔ آندھرا یونیورسٹی میں بشمول سنسکرت دیگر تمام زبانوں کے لئے "چیئرز" قائم ہیں۔ اردو کے لئے کوئی "چیئر" نہیں ہے۔ علاقۂ آندھرا میں ایسی کوئی لائبریری نہیں ہے جہاں اردو کتابیں موجود ہوں یا وہاں اردو جرائد منگوائے جاتے ہوں۔ • نامہ نگار

انجمن ترقی اردو (ملاڈ) کا جلسہ

بمبئی: انجمن ترقی اردو (ملاڈ) کے زیر اہتمام اراکین اور مجلس منتظمہ کے جلسے میں جناب سلام مچھلی شہری کی وفات پر اظہار رنج و ملال کیا گیا۔ قیصر عثمانی صدر انجمن اور مجاہد شولاپوری نے سلام صاحب کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا، اردو کا ایک عالیشان اور اہم ستون ٹوٹ گیا۔

اس جلسے میں چند تجویزیں پیش ہوئیں۔ آخر میں جناب قیصر عثمانی نے اراکین سے اپنے علاقے میں اپنے دوستوں کو ان کی دکانیں میں۔ اردو میں سائن بورڈ لگوانے کی پیش کش کی، احباب اور عزیزوں کو خط و کتابت اور بینک اردو میں لکھنے پر زور دیا۔ جس کی اراکین نے پرزور تائید کی۔

• عبد اللہ زاہد، جنرل سکریٹری

انجمن ترقی اردو شاخ شادنگر کی مہتمم تعلیمات سے نمائندگی

شادنگر، اردو شاخ شادنگر کے ایک سہ رکنی وفد نے مہتمم تعلیمات ضلع محبوب نگر کے دورہ شادنگر کے موقع پر ان سے ملاقات کی۔ وفد نے مدرسہ نسواں فرخ نگر میں چھٹی جماعت میں اردو کے قیام اور اردو اساتذہ کے اضافہ کے لئے نمائندگی کی۔ مہتمم تعلیمات نے اس خصوص میں ممکنہ امداد کا تیقن دیا۔ • نامہ نگار

(صفحہ ۹ سے آگے)

۱۷ نومبر کو دورہ مانگرول کے موقع پر بزم انقلاب مانگرول کی جانب سے پیش کی گئی یادداشت کا جواب دے رہے تھے۔ قیصر رزاقی صدر بزم اور قیصر جعفری معتمد بزم کی قیادت میں ایک وفد نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کر کے کرناٹک میں اردو کو اس کا جائز مقام دینے پر زور دیا۔ یادداشت میں ریاست کے نام کی تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے زبان کنڑی کو ہر سطح پر رائج کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو کرناٹک کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ • دعوت۔ دہلی

اخباروں سے تراشے

اردو ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے

رجسٹرار آف نیوز پیپرز کی طرف سے شائع شدہ ایک رپورٹ کے اعداد و شمار پیش نظر ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد ۸۹۵ تھی جو بڑھ کر ۱۹۷۱ء میں ۱۰۰۵ تک پہونچ گئی۔ البتہ ۱۹۷۲ء میں ان کی تعداد ۹۲۹ رہ گئی۔ ۱۹۷۱ء میں روزناموں کی تعداد ۱۰۲ تھی جب کہ ۱۹۷۰ء میں یہ صرف ۹۳ تھی۔ ۱۹۷۲ء میں بھی اردو روزناموں کی تعداد ۹۳ رہی۔ ۱۹۷۱ء میں اردو کے ہفتہ وار اخبارات کی تعداد ۸۹۴ تھی۔ ۱۹۷۲ء میں اس تعداد میں ۱۱ اخبارات کی کمی ہوگئی۔

اگرچہ ۱۹۷۲ء میں اردو اخبارات کی مجموعی تعداد ۱۹۷۱ء کے مقابلے میں کم ہوئی تاہم ان کی تعداد اشاعت میں ایک لاکھ ۶۷ ہزار کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں اردو اخبارات کی مجموعی اشاعت ۱۵ لاکھ ۴۳ ہزار تھی جبکہ ۱۹۷۱ء میں یہ ۱۳ لاکھ ۷۶ ہزار رہی تھی۔ ۱۹۷۲ء میں اردو زبان کے روزناموں کی اشاعت ۳ لاکھ ۸۲ ہزار رہی جو کہ اپنی جگہ ایک ریکارڈ ہے۔ مدت زیر تبصرہ میں ہفتہ وار اخبارات کی اشاعت ۵ لاکھ ۵۴ ہزار رہی ایک سال قبل کے مقابلے میں تعداد اشاعت میں یہ اضافہ روزناموں کے ضمن میں دس ہزار اور ہفتہ وار اخبارات کے ضمن میں ۴۱ ہزار کا ہوا۔

اردو زبان کے اخبارات کا مرکز خاص طور پر اتر پردیش کی ریاست رہی ہے جہاں سے کہ ۱۹۷۲ء میں ۱۷۹ اخبارات شائع ہوئے اس کے بعد دلی کا نمبر رہا جہاں سے کہ ۱۵۲ اخبارات شائع ہوئے تیسرا نمبر پنجاب کا رہا جہاں سے اردو زبان کے ۱۲۲ اخبارات شائع ہوئے آندھرا پردیش سے مدت زیر تبصرہ کے دوران ۱۲۷ اخبارات شائع ہوئے۔

۱۹۷۲ء میں تمام اردو اخبارات کی مجموعی اشاعت ۱۵ لاکھ ۴۳ ہزار تھی۔ دلی سے اس مدت میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد اشاعت ۴ لاکھ ۷۹ ہزار رہی دوسرا نمبر اتر پردیش کا رہا جہاں کے اخبارات کی تعداد اشاعت دو لاکھ ۴ ہزار رہی دیگر ایسی ریاستیں جہاں اردو زبان کے اخبارات کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ رہی، پنجاب اور آندھرا پردیش تھیں جہاں اخبارات کی تعداد اشاعت بالترتیب دو لاکھ ۹ ہزار اور ایک لاکھ ۳۰ ہزار تھی۔

بڑے متوسط اور چھوٹے اردو اخبارات

۱۹۷۲ء میں صرف ایک بڑا اخبار ایسا تھا جس کی اشاعت ۵۰ ہزار سے زیادہ تھی جب کہ ایک رسالے کی اشاعت ۷۰ ہزار تھی ۱۵ ہزار سے زیادہ اور ۵۰ ہزار سے کم اشاعت والے یعنی متوسط اخبارات کی تعداد گیارہ تھی۔ ان میں چار روزنامے تھے جن کی مجموعی تعداد اشاعت ایک لاکھ ۲۱ ہزار تھی اور سات جرائد تھے جن کی اشاعت ایک لاکھ ۷۰ ہزار تھی۔ چھوٹے اخبارات یعنی ۵ ہزار سے زیادہ لیکن ۱۵ ہزار سے کم اشاعت والے اخبارات کے زمرے میں ۱۹ روزنامے

گئے جن کی اشاعت ایک لاکھ ۷۰ ہزار تھی اور ۳۲ جرائد بھی جن کی اشاعت ۲ لاکھ ۷۰ ہزار تھی۔ • قومی آواز۔ لکھنؤ

جدوجہد آزادی میں اردو کی خدمات کا اعتراف

لکھنؤ: کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری راجیشور راؤ نے اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے نام اپنے ایک پیغام میں ملک کے اردو پریس کی حب الوطنی اور جدوجہد کے جذبے کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اپنے پیغام میں جناب راجیشور راؤ نے کہا ہے کہ اردو صحافت نے برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا اردو ہماری ملی جلی ثقافت کی علامت ہے لیکن بدقسمتی سے آزادی کے بعد اردو کو سیاسی اور فرقہ وارانہ تعصب کا شکار ہونا پڑا حالانکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس زبان کی ترویج وترقی کے لئے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اس خوشی کا اظہار کیا کہ حالیہ برسوں میں اردو زبان کے سلسلے میں نمایاں سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں۔

پیغام میں مزید کہا گیا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اردو زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھے گی۔

• دعوت۔ دہلی

اردو اکیڈمی معائنہ کمیٹی کو مراد آباد میں دورہ کرنے کی دعوت

سنبھل: انجمن ترقی اردو سنبھل کے جنرل سکریٹری جناب صدیقی نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اترپردیش اردو اکاڈمی سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ وہ اردو معائنہ کمیٹی کے مجوزہ دورہ میں ضلع مراد آباد کو بھی شامل کرے۔

اپنے بیان میں انھوں نے کہا کہ اردو اکاڈمی نے ریاست میں اردو کے ساتھ ہونے والی دھاندلیوں اور ناانصافیوں کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک معائنہ کمیٹی کی تشکیل کرکے قابل تحسین قدم اٹھایا ہے۔ حال ہی میں اردو معائنہ کمیٹی نے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور اردو مخالف رویہ کی چھان بین کی۔

یہ کمیٹی آئندہ چند روز میں دیگر مقامات کا بھی دورہ کرے گی۔ مگر حیرت ہے کہ کمیٹی نے اپنے مجوزہ پروگرام میں مراد آباد جیسے اہم ضلع کو نظرانداز کر دیا ہے۔ مراد آباد ضلع میں اکثریت کی زبان اردو ہے لیکن یہاں بھی اردو دشمنی کا وہی عام رجحان غالب ہے جو متعصب اور تنگ نظر سرکاری ملازمین کا طرۂ امتیاز ہے۔ اردو اکاڈمی کا فرض ہے کہ وہ ضلع مراد آباد میں اردو کے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں کی تحقیقات کرنے کے لئے اردو معائنہ کمیٹی کو یہاں بھیجنے کا بندوبست کرے۔ تاکہ اردو اپنے مرکز ومحور میں صحیح مقام حاصل کرسکے۔ • الجمعیۃ۔ دہلی

چار ہزار اردو ٹیچروں کا تقرر

لکھنؤ: ریاستی حکومت نے آج فیصلہ کیا ہے کہ پرائمری اسکولوں میں چار سو اردو ٹیچروں کی تقرری ۳۰ رنومبر تک مکمل ہو جانا چاہیے۔ ان اسکولوں میں تقریباً تین ہزار ۶ سو اردو ٹیچروں کو اب تک مقرر کیا جا چکا ہے۔ یہ فیصلہ ایک جلسہ میں کیا گیا ہے جس کی صدارت جونیئر وزیر تعلیم جناب راج بہادر سنگھ نے کی۔ جناب سنگھ نے اس بات کو دہرایا کہ اگر خواتین اردو ٹیچرس دستیاب نہ ہوں تو لڑکیوں کے اسکولوں میں ریٹائرڈ اردو ٹیچر لازم رکھے جائیں۔

• سیاست جدید۔ کانپور

دہلی ایڈمنسٹریشن اور اردو

دہلی ایڈمنسٹریشن کے ذمہ داران خصوصاً چیف ایگزیکیٹو کونسلر ہر سال اردو میڈیم اسکول کھولنے کا اعلان کرتے ہیں لیکن ۱۵ سالوں میں ایک بھی گورنمنٹ بوائز اسکول وجود میں نہیں آیا۔

دہلی ایڈمنسٹریشن ہر سال کتنے ہی نئے اسکول کھولتی ہے۔ کتنے ہی ایڈیڈ مڈل اسکولوں کو ہائر سکنڈری بناتی ہے پنجابی ہندی، سندھی، گجراتی غرض ہر زبان کے اسکولوں کو کھولا جاتا ہے لیکن صرف اردو میڈیم کا اسکول کھولنے یا کسی مڈل اسکول کو ہائر سکنڈری بنانے میں شرطیں وہ بھی بے بنیاد لگائی جاتی ہیں۔

اینگلو عربک اور فتحپوری اسکول داخلوں کی زیادتی سے پریشان ہیں۔ شفیق میموریل اسکول اردو علاقوں سے اتنی دور ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو بھیجنا نہیں چاہتے۔ ان کے علاوہ منظر الاسلام اور قومی مڈل اسکول ایسے تھے جنھیں ہائر سکنڈری بنایا جا سکتا تھا ذمہ داران اسکول سے معلوم ہوا کہ یہ اسکول ہائر سکنڈری کی منظوری لینے کے لئے چار سال سے کوشش کر رہے ہیں لیکن دہلی ایڈمنسٹریشن بڑے خوبصورت انداز میں شرطیں لگا کر نظرانداز کرتا رہا ہے۔ • قومی آواز۔ لکھنؤ

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے

حیدرآباد: وزیر اعلیٰ جناب دیوراج ارس نے ریاست کرناٹک میں اقلیتی زبانوں بالخصوص اردو کو اس کا جائز مقام اور سہولتیں دینے کا تیقن دیا۔ اور عوام کو لسانی تعصب سے احتراز کرتے ہوئے دوسری زبانیں سیکھنے کا مشورہ دیا۔ وزیر اعلیٰ کرناٹک جناب دیوراج ارس

(باقی صفحہ ۱۰ کالم ۱)

دوسرے اداروں کی خبریں

مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کا خیر مقدم اور پروفیسر آل احمد سرور کو الوداعی عصرانہ

علی گڑھ: ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر مقرر ہونے پر پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب جولائی میں تین سال کے بعد آکسفورڈ (انگلستان) سے واپس آئے ہیں۔

۱۶ اکتوبر کو شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی طرف سے پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے ریٹائر ہونے پر ایک عصرانہ دیا گیا۔ نئے صدر صاحب نے پروفیسر سرور اور بیگم سرور کا خیر مقدم کیا۔　　● پبلسٹی انچارج شعبۂ اردو

پروفیسر مسعود حسین خاں کا استقبال

نئی دہلی: ادبی انجمن زیر اہتمام اردو کے ماہر لسانیات اور ادیب پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ مقرر ہونے پر ایک استقبالیہ تقریب مشہور اردو ادیب و مفکر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی صدارت میں ہوئی۔ استقبالیہ تقریر میں سکریٹری سید نظر برنی نے کہا کہ مسعود حسین صاحب نے شرافت، وضعداری، انکساری اور فہم و فراست جیسی اعلیٰ انسانی صفات بھی اپنے قابل فخر اسلاف ... کی شکل میں پائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ جس ادارے سے بھی وابستہ رہے وہاں اپنی ہمہ جہت شخصیت کی بھرپور چھاپ چھوڑ آئے۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے تاریخ زبان اردو کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی لسانی تحقیق کی داد دی۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے فرمایا کہ زبان ترقی کے تین مراحل سے گزرتی ہے۔ بولی، شاعری اور علمیت۔ ہماری اردو زبان ابھی شاعری کی منزل میں ہے اور وہ ابھی علمی زبان نہیں بن سکی ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جامعہ ملیہ اردو کو علمی زبان بنانے کے لئے ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ میں ادبی سنگم کی خدمات سے بخوبی واقف ہوں اور میں اس کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ہر ممکن تعاون کے لئے تیار ہوں۔

● سکریٹری ادبی سنگم، نئی دہلی

بہترین اردو کتابوں کے مصنفین کو ایک لاکھ روپیہ کی پیش کش

لکھنؤ: اترپردیش اردو اکاڈمی نے طے کیا ہے کہ ہر سال پانچ پانچ ہزار کی رقم اردو کے دو ممتاز ترین مصنفین کو ان کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں بطور انعام پیش کرے۔ ایسے ممتاز ادیبوں کی بیواؤں کو بھی یہ انعامات دئے جا سکتے ہیں جن کا انتقال گزشتہ تین سال کے اندر ہوا ہے۔

علاوہ ازیں اترپردیش اردو اکاڈمی نے طے کیا ہے کہ ہر سال تین تین ہزار روپیہ کے خصوصی انعامات ان مصنفین کو دئے جائیں گے جن کی کتابیں یکم جنوری ۱۹۷۳ء کے بعد موضوعات ذیل میں سے کسی ایک موضوع پر بہترین لکھی جائیں گی اور دوران سال اردو میں شائع ہوئی ہوں گی۔

(۱) طبیعاتی علوم (جس میں انجینئرنگ بھی شامل ہے)
(۲) حیاتیاتی علوم (جس میں طب یونانی بھی شامل ہے)
(۳) سماجی علوم۔
(۴) ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی یک جہتی۔
(۵) ادبی تنقید۔
(۶) افسانوی ادب (جس میں ناول، افسانہ، ڈرامہ شامل ہے)

(۶) افسانوی ادب (جس میں ناول، افسانہ، ڈرامہ شامل ہے)
(۷) شعر و سخن
(۸) فنون لطیفہ
(۹) انشائیہ، سوانح نگاری و دیگر اصناف ادب
(۱۰) کلاسیکی اردو ادب کے کسی شاہکار کی بہترین ایڈیٹنگ یا تحقیقی کام پر
(۱۱) ہندوستان کی کسی زبان کی مطبوعہ تصنیف کا بہترین اردو ترجمہ۔
(۱۲) دیگر زبانوں میں شائع شدہ کسی کتاب کا بہترین اردو ترجمہ۔

ان کے علاوہ دو ہزار اور ایک ہزار روپیہ کا ایک انعام اردو کے ان ناشروں کو دیا جائے گا جن کی مطبوعات، کتابت، طباعت اور دیدہ زیبی وغیرہ کے لحاظ سے بہترین ہوں گی۔ مندرجہ بالا انعامات کے علاوہ دو ہزار، ڈیڑھ ہزار، ایک ہزار اور پانچ سو روپیہ کے مختلف انعامات بھی جن کی مجموعی رقم اکیاون ہزار ہوگی اردو کی دوسری کتابوں کے ان مصنفین کو دیے جائیں گے جن کی کتابیں دوران سال شائع ہوئی ہوں گی۔

یکم جنوری ۱۹۸۳ء اور ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کے درمیان شائع ہونے والی کتابیں اتر پردیش اردو اکادمی کو انعامات دینے کے لئے مطلوب ہیں۔ ان کتابوں کی آٹھ آٹھ جلدیں سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی (۳۰ - آر - کے۔ منڈن روڈ، قیصر باغ لکھنؤ) کو اس طرح بھیجی جائیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ء تک ان کے پاس پہنچ جائیں۔ جو کتابیں بھیجی جائیں ان کے سرورق کے دوسرے صفحہ پر مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے۔

مصنف کا نام اور پتہ
ناشر کا نام اور پتہ
کتاب کی قیمت
سال اشاعت (اگر ممکن ہو تو ماہ اشاعت)

اور مصنف کی یہ تصدیق کہ اس کتاب پر کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے سے کوئی انعام اس کو نہیں ملا ہے۔ انعام کے لئے ان کتابوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے جن کا اس مدت میں کوئی نیا ایڈیشن نکلا ہو۔

• سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی

پروفیسر شعیب راہی کے اعزاز میں شعری نشست

داتا گنج
بدایوں

جناب پروفیسر شعیب راہی کے اعزاز میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملنے پر ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا۔ موصوف کو امسال ان کے تحقیقی مقالہ "آتش لکھنوی حیات اور شاعری" پر پٹنہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی ہے۔ مشاعرہ میں متعدد شعرا نے آپ کے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

• جلال الدین خاں آرزو بدایونی

صفحہ ۹ سے آگے

ایک موقع پر رشید صاحب اپنی لڑکی کی جواں مرگی کا ماتم بھی کر گزرے ہیں جس میں فن کا نہیں باپ کے دل کی دھڑکن کو بھی دخل ہے:

"— اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ کو گزرے ہوئے دس بارہ سال ہو گئے لیکن اس نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا جس سے میں عبارت تھا اور جن کو میں حاصل حیات جانتا تھا۔ احباب اور اعزا جو میرے اس حال سے واقف ہیں وہ اس حادثے اور مرحومہ کا ذکر اشارۃً بھی میرے سامنے نہیں کرتے۔ اب جو کر رہا ہوں وہ اس مجبوری اور ڈر کی بنا پر ہوتا ہے کہ اپنے اور پرائے لعنت نہ بھیجیں لیکن نفس کے سارے مطالبات تو پورے کرتا ہے صرف کام نہیں کرتا۔ کیسی بے بسی اور اس سے بڑھ کر ہوتی بے اختیاری ہے کہ اس وقت اس سانحے کے ذکر سے نہ باز رہتے بن پڑتا ہے نہ بیان کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ فانی کا یہ شعر فانی ہی کی زبان سے سنا ہے لیکن اس وقت وہ اثر نہیں ہوا تھا جو اب ہے: —

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
دنیا جب بھی بستی تھی دنیا اب بھی بستی ہے

خیال ہے کہ یہ شعر میری حالت کو پہنچ کر فانی نے نہ کہا ہوگا۔ اب دعا ہے کہ کوئی دوسرا اس میں پہنچ کر اسے پڑھنے پر مجبور نہ ہو۔"

تبصرہ

اطہر پرویز

ہمارے ذاکر صاحب

مصنف: پروفیسر رشید احمد صدیقی

ذاکر صاحب کا ذکر اور رشید صاحب کی زبان سے — اس کا کہنا ہی کیا۔ یوں تو ذاکر صاحب کے بارے میں کتنوں نے لکھا اور کتنے اور لکھیں گے، جس میں ان کی ذات و شخصیت کے مختلف پہلو نظر آئیں گے۔ کوئی ان کا سراپا پیش کرے گا، کوئی سیرت کی طرف اشارہ کرے گا لیکن وہ باتیں جو رشید صاحب نے روزمرہ کے انداز میں لکھ دیں، ان میں سچ پوچھئے تو ذاکر صاحب، ذاکر صاحب نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کو برسوں دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے — ان کو شیروانی میں ملبوس — ایک ایک بٹن لگائے، اپنی انگلیوں سے اپنی گرد جھاڑتے — دوسروں کی گرد جھاڑتے، ان کے بٹن لگاتے — اس طرح بہتوں نے انھیں دیکھا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں اور محاورہ بھی یہی ہے کہ جب کوئی بہت اچھی طرح باتیں کرتا ہے تو گویا اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں لیکن یہ گل افشانیٔ گفتار ذاکر صاحب کے یہاں ہی دیکھی جا سکتی تھی۔ لوگوں کو وہ جلسوں میں تقریر کرتے نظر آتے ہوں گے — جلسوں کا اہتمام کرتے دکھائی دیے ہوں گے ان کو ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے دیکھا ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ انھیں لوگوں نے جہاں کہیں بھی دیکھا ہوگا، شیروانی میں ملبوس دیکھا ہوگا۔ ہاں رشید صاحب نے ضرور انھیں کرتا پاجامہ پہنے، بغیر شیروانی کے دیکھا ہوگا۔ میری مراد ان کے محفلی با تطبیع ہونے سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب کے مضامین میں ایک بے تکلف ذاکر صاحب نظر آتے ہیں، جو کبھی مونگ پھلی کھا رہے ہیں تو کبھی دال موٹھ اور مٹھائی سے شغل کر رہے ہیں۔ کبھی کابلی چنے خرید رہے ہیں تو کبھی ہاتھرس کے اسٹیشن سے ہاتھرس کا چاقو لے رہے ہیں۔ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کے ساتھ سفر بھی کیا ہے اور رشتہ یگانگت بھی کی ہے۔ سفر ایک ایسا موقع ہوتا ہے جس میں ہم سفر کی شخصیت کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور آدمی اپنے اصلی روپ میں نظر آتا ہے۔ ورنہ ویسے تو عام طور پر لوگ الف لیلی کے پرندے کا لباس پہنے ہوتے ہیں۔ اسی لئے شاید رشید صاحب کے ایک عزیز و محترم دوست نے ان سے شکایت کی کہ "آپ ذاکر صاحب کے بارے میں کیا اناپ شناپ لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کے وقار کا تو لحاظ کیا کیجئے۔ لوگ ان کے بارے میں کیا خیال کریں گے۔ آپ کو تو تفریح کی سوجھتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی رسوائی ہوتی ہے" — یہ محترم دوست ذاکر صاحب کے عقیدت مند ہوں گے، ان سے محبت کرتے ہوں گے لیکن وہ شخصیت کے وقار کو اسی طرح سمجھتے ہوں گے جس طرح کچھ لوگ لباس اور بول چال ہی کو تہذیب سمجھتے ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ رشید صاحب نے اس دوست کا احترام تو کیا، لیکن مشورے کو نظرانداز کر دیا ورنہ ہم ذاکر صاحب کی شخصیت کے اہم ترین پہلوؤں سے ناواقف رہتے اور اردو ادب شخصیت نگاری کے اہم باب سے محروم رہتا۔

رشید صاحب نے روزمرہ کے انداز میں ذاکر صاحب کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا — جس میں ان کا جمال بھی دکھائی دیتا ہے اور جلال بھی — ذاکر صاحب سے متعلق رشید صاحب کے مضامین پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم ان کے گھر میں بغیر اطلاع کے اور دروازہ کھٹکھٹائے بس کریپ سول پہنے داخل ہو گئے ہیں اور ذاکر صاحب کو خبر نہیں — وہ دیکھئے دنیا سے بے نیاز اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔

ذاکر صاحب جامعہ کے شیخ الجامعہ ہوں — علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوں — بہار کے گورنر ہوں — نائب صدر یا صدر جمہوریہ ہوں — لیکن ان کے ساتھ ایک ہی صفت لگی ہوئی ہے اور وہ ہے "ذاکر صاحب"۔ عام طور پر لوگ مناصب کے ساتھ بدل جاتے ہیں گویا اپنے آپ کو منصب میں ڈھال لیتے ہیں لیکن ذاکر صاحب نے ان سب کو اپنی شخصیت میں سمو لیا۔ اس لئے ان مناصب نے ذاکر صاحب کو عزت نہیں دی۔ ذاکر صاحب نے ان منصبوں کو وقار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد جب کوئی اس منصب کو اوڑھتا تو یہ منصب کچھ ڈھیلا ڈھیلا سا لگتا۔ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ کسی کا اترن نہیں پہننا چاہیے۔ ذاکر صاحب نے جس منصب کو چھوڑا، وہ اترن بن گیا۔

میں نے ذاکر صاحب کے پرستاروں میں طرح طرح کے لوگ دیکھے — بیگم قدسیہ زیدی کو دیکھا۔ اسحٰق میاں کو دیکھا۔ جواہر لال نہرو کو دیکھا — پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دیکھا

(باقی صفحہ ۲ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علیگڑھ) پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علیگڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ سے شائع کیا